www.KitaboSunnat.com

تحقیق وتنقید

پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

غلام احمد پرویز کی 'قرآنی خدمات'

مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نظر میں

بیماریوں میں خطرناک ترین بیماری وہ ہوتی ہے جس کی علامات عیاں نہ ہوں اور وہ مریض کو صحت مندی کے دھوکے میں مبتلا رکھ کر اُسے آہستہ آہستہ سوئے گور دھکیل رہی ہو۔ رہی وہ بیماری جس کی علامات واضح اور اُجاگر ہوں تو وہ چنداں خطرناک نہیں ہوتی کیونکہ انسان اس کی علامات واضح ہوتے ہی اپنی مدافعانہ کاوشیں شروع کردیتا ہے۔ اس کے برعکس ایسا مرض جو اپنے آثار وعلامات کو مخفی رکھتے ہوئے اندر ہی اندر صحت کی جڑیں کاٹتا رہے، ایسے پُراسرار مرض کے سامنے انسان لاچار اور بے بس ہوکر رہ جاتا ہے!

عداوتوں میں بدترین عداوت وہ ہوتی ہے جو دوستی کے پیرائے میں اختیار کی جائے اور انسان کو پتہ ہی نہ چل پائے کہ اس لباسِ خُلّت میں ملبوس شخصیت اس کی دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔ انسان اپنے کھلے دشمن سے نقصان اُٹھا سکتا ہے مگر دھوکا نہیں کھا سکتا، لیکن اُس دشمن سے جو عداوت کا لباس پہن کر نہیں بلکہ دوستی کا لباس پہن کر آتا ہے اور بابِ عداوت سے نہیں بلکہ پُرخلوص دوستی کے دروازے سے وارد ہوتا ہے، انسان دھوکا بھی کھاتا ہے اور نقصان بھی اُٹھاتا ہے۔

اپنے آثار کو نمایاں کردینے والی بیماری کی نسبت، اپنی علامات کو مخفی رکھنے والی بیماری —— اور کھلے دشمن کی کھلی دشمنی کی نسبت، دوستی کے بھیس میں چھپی ہوئی عداوت بدرجہا خطرناک ہوتی ہے۔

کھلے اور چھپے اعداے اسلام

ہمارے دشمنوں کی ایک قسم وہ ہے جس کے افراد کھلے بندوں ہمیں ہمارے دین سے

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہماری تہذیب کے ایسے دشمنوں نے ہمارے دین کے مقابلہ میں ایک ایسا خودساختہ دین پیش کیا ہے جو خدا پرستی کی بجائے ہوا پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کا پورا نقشہ حیات، ہمارے اسلامی نقشہ حیات کی ضد واقع ہوا ہے، جس میں خیروشر کی بنیاد، انبیاے معصومین کے مبنی بروحی ٹھوس علم پر ہونے کی بجائے آزاد فکر فلسفیوں کے ظنی قیاسات پر قائم ہے۔ بدقسمتی سے تقریباً سارا عالمِ اسلام ہمارے دین وتہذیب کے ان کھلے دشمنوں کی سیاسی غلامی میں صدیوں مبتلا رہا ہے۔ عالمِ اسلام کا اگرچہ بیشتر حصہ، اب سیاسی آزادی سے ہم کنار ہوچکا ہے، لیکن ابھی تک وہ ذہنی غلامی سے چھٹکارا نہیں پاسکا۔

جن دنوں ہم سیاسی طور پر اسلام دشمن قوتوں کے غلام تھے، ان دنوں سامراج نے ہماری دینی روایات اور تہذیبی نشانات کو بڑے منظم لیکن غیرمحسوس طور پر مٹانے کی کوششیں کیں۔ خدا ورسول ؐ کی تعلیمات کی بجائے، دہریت کی آغوش میں پلے ہوئے فلاسفہ کے نظریات کو پھیلایا گیا۔ ردّ وقبول اور اَخذ وترک کے اسلامی پیمانوں کی جگہ جدید تہذیب کی اقدار کو معیار گردانا گیا۔ ملکی قانون کو (جو جس حد تک بھی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ رہ گیا تھا) بدل کر استعماری قانون نافذ کردیا گیا۔ درسگاہوں میں ہمارے تہذیب وفکر اور تمدنی آثار کی بجائے، استعماری فکر اور مغربی آثارِ مدنیت کو فروغ دیا گیا، تاکہ اُمتِ مسلمہ کا قرآن اور نبی ُقرآن سے تعلق ٹھوس علمی، عقلی اور ایمانی بنیاد پر قائم رہنے کی بجائے (بشرطیکہ وہ رہ بھی جائے، تو) جذباتی، تقلیدی اور موروثی بنیاد پر قائم ہوجائے۔

یہ سب کچھ ہماری تہذیب اور ہمارے دین کے ان کھلے دشمنوں نے برسرعام کیا۔ اُمت مسلمہ چونکہ اپنے ان کھلے دشمنوں اور ان حیلہ جوئیوں سے واقف تھی، اس لئے ان سے فریب خوردہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُنہوں نے مخلوط سوسائٹی کی ترویج کی مگر ملت اسلامیہ کی غالب اور عظیم اکثریت نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اُنہوں نے بہتیرا شور مچایا کہ قربانی ایک 'وحشی' رسم ہے، مگر اُمت نے اس مَنْسَك کو برقرار رکھا۔ اُنہوں نے تعلیم کے ذریعہ اپنی فکر کو مسلط کرنے کی کوشش کی مگر ملتِ اسلامیہ کے اکابر نے اس مسموم تعلیم کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے جداگانہ تعلیمی اداروں کا بندوبست کرلیا۔ اُنہوں نے دفتری

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظام الاوقات میں نماز کی ادائیگی کے لئے کوئی وقت نہ رکھا، مگر مسلمانوں نے نماز کو ترک نہ کیا۔ الغرض مسلمانانِ ملت نے اپنے ان کھلے دشمنوں کی ان گمراہ کن چالوں سے اپنے آپ کو محفوظ و مصئون رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ اگر ایک مختصر اور حقیر سی اقلیت نے تہذیبِ غالب کا رنگ اختیار کیا بھی تو اس کے اکثر و بیشتر افراد اپنے دلوں میں ندامت و شرمساری محسوس کرتے رہے۔ یہ تھے ہمارے دین کے کھلے دشمن اور یہ تھیں ان کی چالیں اور یہ تھیں وہ دفاعی تدابیر جو مسلمانوں نے ان اعدائے دین کے خلاف چوکنے ہو کر اختیار کیں۔

اُن کھلے دشمنانِ دین کے بعد، اب ذرا ان نقاب پوش اعدائے اسلام کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مصلحین کے روپ میں مسلمان معاشرے میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی فکر اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جو ہمارے کھلے اعدائے دین نے پیش کیا ہے۔ ان کے ردّ و قبول اور اخذ و ترک کے بنیادی معیار وہی ہیں جو ہمارے کھلے دشمنوں کے ایجاد کردہ ہیں۔ اگر وہ لوگ اپنی لذت پرستانہ مدنیتِ فاسدہ کی بدولت حجابِ نسواں کو جاہلانہ رسم قرار دیتے ہیں تو یہ لوگ قرآن ہاتھ میں لے کر اُمتِ مسلمہ کو یہ باور کرانے میں کوشاں ہیں کہ پردہ ملاؤں کی ایجاد کردہ رسم ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لوگ اگر قربانی کو 'وحشی رسم' قرار دیتے ہیں تو یہ لوگ بھی، اس میں کوئی 'تجربی فائدہ' اور 'حسی منفعت' نہیں پاتے۔ وہ لوگ اگر اپنی شہوت پرستانہ تہذیب کی بدولت مرد وزن کی مخلوط سوسائٹی کے قائل ہیں تو یہ 'فکرِ اسلامی' اور فقط 'قرآنی سندیت' کے علمبردار 'مخلوط سوسائٹی کے وجود' کو قرآن سے کشید کر ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ اگر اپنے دفتری اوقات میں نماز کا وقفہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں تو یہ لوگ 'معارف القرآن' بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد سرے سے یہ نماز ہے ہی نہیں جو مساجد میں پڑھی جاتی ہے، بلکہ اس سے مراد ایک خاص قسم کا نظام قائم کرنا ہے۔

الغرض ہمارے کھلے مگر 'دانا دشمن' ہمیں اسلام سے منقطع کر کے اپنی جاہلانہ تہذیب کی طرف کھلے عام دعوت دیتے ہیں، مگر اسلام کے یہ 'نادان دوست' بھی اگرچہ ہمیں اُسی جاہلیت کی طرف بلاتے ہیں، مگر اس فریبِ یقین کے ساتھ کہ یہی جاہلیت دراصل عین اسلام ہے۔ ہمارے کھلے دشمن جب ہم سے اسلام کو ترک کروا کر ہمیں اپنی گمراہ کن معاشرت کی طرف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بلاتے ہیں تو وہ ہمیں یہ دھوکہ نہیں دیتے کہ اب تم جس معاشرت کی طرف آرہے ہو یہی اسلام کی مطلوبہ معاشرت ہے۔ مگر یہ لوگ جب قرآن کے نام پر ہمیں مغربی معاشرت کی طرف دعوت دیتے ہیں تو اس فریب کے ساتھ کہ اصل 'قرآنی معاشرت' یہی ہے جس کی طرف ہم تمہیں بلا رہے ہیں۔ وہ لوگ اپنی فکر کو اپنے فلسفیوں اور سماجی مصلحین کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے قبول کرنے کی ہمیں ترغیب دیتے ہیں مگر یہ لوگ اسی فکر کو مغربی مفکرین کے نام پر نہیں بلکہ قرآن اور اسلام کے حوالہ سے اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ نتیجتاً اگر ایک مسلمان کھلے اعداے دین سے متاثر ہوکر ان کی فکر ونظر کو اپنا لیتا ہے تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتا کہ وہ اب بھی مسلمان ہے۔ مگر ان حضرات کی تبلیغ کے نتیجہ میں اگر کوئی شخص اسلامی فکر کو ترک کرکے فرنگی فکر کو قبول کرتا ہے تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ بدستور اور حسبِ معمول مسلمان ہے کیونکہ 'فکرِ اسلامی' کے علمبرداروں نے اور اُفقِ پر نیا 'طلوعِ اسلام' کرنے والوں نے یہی یقین دلایا ہے۔

ہمارے تعلیم یافتہ مگر سادہ لوح مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اگر کارل مارکس اور اینجلز کے نام سے اُنہیں کمیونزم کی طرف دعوت دی جائے تو وہ اس دعوت پر کان بھی نہیں دھرتے اور اسے خلافِ اسلام نظام قرار دے کر ردّ کردیتے ہیں، لیکن آفتابِ آزادی کے ساتھ ہندوستانی آسمان سے سرکتا ہوا 'طلوعِ اسلام' جب اُفق پر پہنچتا ہے اور اسی یہودی نظام کو 'قرآنی نظامِ ربوبیت' کے نام سے اسلام ہی کا جدید ایڈیشن قرار دیا جاتا ہے تو وہ سادہ لوح مسلمان جو اس نظام کو کارل مارکس کے نام پر لینے سے گریزاں تھا، اب آمادۂ قبول نظر آتا ہے۔ مغربی مفکرین جن خلافِ اسلام افکار ونظریات کو ہمارے قلوب واذہان پر مستولی نہ کرپائے، ہمارے غلام فطرت مستغربین انہی افکار ونظریات کو اُمتِ مسلمہ میں رواج دینے کی بھرپور کوشش کررہے ہیں۔ صرف فکر اور نظریہ ہی کی حد تک نہیں بلکہ عملاً مدنیت ومعاشرت کا پورا نقشہ بھی یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں جو تہذیبِ مغرب کا تشکیل کردہ ہے اور لطف یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ دھوکہ قرآن کے نام پر دیا جارہا ہے۔ یہ لوگ اُٹھتے بیٹھتے نام 'قرآن' کا لیتے ہیں لیکن ہم نوائی ان لوگوں کی کرتے ہیں جو دشمنانِ قرآن اور اعداے اسلام ہیں۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حجیتِ قرآن کا نعرہ

ان لوگوں کو، اپنی اقدار دریا برد کردینے کے لائق نظر آتی ہیں اور مغرب کی ہر قدر قابل قبول دکھائی دیتی ہے۔ قرآن کے نام پر یہ لوگ جو کچھ بھی کہتے ہیں، وہ قرآن کی نہیں بلکہ غیروں کی بات ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن زاویۂ نگاہ، غیر قرآنی ہوتا ہے۔ کان اگرچہ ان کے اپنے ہیں مگر وہ سنتے، بیگانوں کی ہیں۔ دماغ اگرچہ ان کا سوچتا ضرور ہے، مگر غیروں کی فکر کے زیر اثر رہ کر: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ 'حجیتِ قرآن' اور 'سندیتِ کتاب اللہ' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں:

① — صحت وسقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے، نہ میرا دعویٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی میری گذارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اِسے کہو کہ اس کے لئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔ ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [1]

② — کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لئے کسی انسان کی سند کافی نہیں ہوسکتی اس کے لئے سند صرف خدا کی کتاب کی ہونی چاہئے۔ [2]

③ — ہمارے نزدیک سند اور حجت خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا قول۔ اس لئے خدا کی کتاب کے خلاف، اگر کوئی شخص اقبال اور جناح کا بھی کوئی قول پیش کرتا ہے تو قرآن کی رو سے وہ سند نہیں ہوسکتا۔ [3]

لیکن عملاً قرآن حجت نہیں!

سندیتِ قرآن اور حجیتِ قرآن کے یہ سب دعوے، محض الفاظ کے پھاگ ہیں جو منہ سے اُڑا دیے جاتے ہیں، عملاً جس چیز کو حجت قرار دیا جاتا ہے، وہ تہذیبِ مغرب کے افکار ونظریات ہیں اور قرآن کی تشریح وتوضیح بدیسی معتقدات ہی کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اگرچہ ڈھنڈورا یہی پیٹا جاتا ہے کہ ''ہم قرآن کریم کی تفسیر، قرآنِ کریم ہی سے کرتے ہیں۔''

---

① طلوع اسلام، مئی ۱۹۵۲ء، ص ۴۸ ② طلوع اسلام، جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۵۸

③ اصل حوالہ تو سردست میسر نہیں البتہ 'طلوع اسلام'، مارچ ۱۹۵۶ء، ص ۳۲ پر واقع عبارت کا مفہوم بھی یہی ہے۔

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی بہت سی مثالوں میں سے چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

پہلی مثال (فلسفہ تاریخِ اَدیان کے حوالہ سے)

مغرب کے ملحد فلاسفہ اور علم الانسان کے ماہرین کے جس قیاس و خیال کو ہمارے 'مفکر قرآن' نے اپنے شرفِ اعتقاد واعتماد سے نواز رکھا تھا، وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز روشنی میں نہیں بلکہ تاریکی میں ہوا تھا اور روئے زمین پر سب سے پہلا دین، دین توحید نہیں بلکہ دین شرک تھا۔ مغرب کے اس گمراہ نظریہ پر، ایمان و یقین لانے والے کے لئے بھلا کب ممکن رہتا ہے کہ وہ قرآن کے پیش کردہ حقائق کو تسلیم کرے۔ قرآنِ کریم کی روشنی میں سب سے پہلے انسان کو اللہ کی طرف سے نورِ علم سے سرفراز کیا گیا تھا، تاکہ وہ اپنے افرادِ خانہ اور اولاد واحفاد کو جادۂ ہدایت پر گامزن رکھے، کیونکہ انسان خواہ کسی بھی عصر ومصر سے تعلق رکھتا ہو، اسے راہِ راست کی طرف رہنمائی کرنا خود اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت کی بنا پر اپنے ذمہ لے رکھا ہے، جیسا کہ خود اس کا فرمان ہے:

﴿وَعَلَى اللهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ﴾ (النحل:۹)

''اور اللہ ہی کا یہ کام ہے کہ وہ ٹیڑھے راستوں میں سے راہِ راست کی طرف رہنمائی کرے۔''

﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾ (اللیل:۱۲)

''بے شک رہنمائی کرنا، ہمارے ہی ذمہ ہے۔''

قرآنِ کریم کے ان واضح حقائق کو پس پشت ڈال کر مغرب کی ذہنی غلامی کا شکار ہوکر ہمارے 'مفکرِ قرآن' نہ تو سب سے پہلے انسان کو نبی تسلیم کیا کرتے تھے اور نہ ہی ابتدائی اور اوّلین انسانی معاشرہ کو برسر ہدایت سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے انکارِ نبوت کی اصل وجہ، دراصل وہ فلسفہ تاریخ ہے جسے مغرب نے پیش کیا ہے اور جسے پرویز صاحب بہ دل و جان قبول کرچکے تھے۔ نبوتِ آدمؑ کا اقرار واعتراف، مغربی فلسفہ تاریخ سے میل نہیں کھاتا جبکہ اسلامی فلسفہ تاریخ کی رو سے آدمؑ کی نبوت کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ روئے زمین پر اوّلین انسان کے ظہور پذیر ہونے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلسلۂ رشد وہدایت کا آغاز واجرا، رحمتِ خداوندی کا ویسا ہی ناگزیر تقاضا ہے جیسا انسان کی

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادّی ضروریات کو پورا کرنا۔ قرآن کریم کی رو سے تخلیقِ بشر (آدمؑ) کا مقصد ہی زمین میں خلافتِ الٰہیہ کے فرائض انجام دینا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اللہ کی مرضی اور ہدایت پر چلے۔ (اور اس کی ہدایت اور مرضی کا علم، وحی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، لہٰذا یہ اٹل اور ناگزیر امر ہے کہ اوّلین انسان (آدمؑ) کو نبی مانا جائے) اب اگر وہ خدائی رہنمائی سے انحراف کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ خلافت کی بجائے بغاوت کی راہ اختیار کرتا ہے، بلکہ وہ مستحق سزا بھی قرار پاتا ہے۔ یہ سزا دنیا میں ضیق قلب اور آخرت میں دخولِ جہنم کی صورت میں ہوگی۔ لیکن اگر وہ نیابتِ الٰہیہ کے فرائض، مرضاتِ الٰہیہ کے تابع انجام دیتا ہے تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی انعامِ خدا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ آدمؑ کو زمین پر بطورِ خلیفہ اُتارتے وقت یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے واضح کردی تھیں:

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى * وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى﴾

(طٰہٰ:۱۲۳تا۱۲۴)

''اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا، تو اس کے لئے دُنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اُسے اندھا اٹھائیں گے۔''

چنانچہ آدمؑ جو ابوالبشر اور ابوالانسان تھے۔ اسے اُمورِ خلافت کی انجام دہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نورِ ہدایت سے نوازا اور مقامِ نبوت پر سرفراز فرمایا۔ اس طرح انسانی معاشرہ کی ابتدا کفر و شرک اور الحاد و دہریت کی تاریکیوں میں ہونے کی بجائے توحید و رسالت اور رشد و ہدایت کی روشنی میں ہوئی لیکن 'مفکرِ قرآن' کے قلب و ذہن اور حواس و مشاعر پر جو فلسفہ اپنی مضبوط گرفت قائم کرچکا تھا، اس کی رو سے انسانی معاشرہ کی ابتدا، کفروشرک یا الحاد و دہریت سے ہوئی تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہ معاشرہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا توحید تک پہنچا، اس طرح بہت بعد میں کہیں جاکر سلسلۂ وحی و رسالت آغاز پذیر ہوا۔ ابتدائی انسانی معاشرہ کے متعلق پرویز صاحب خود لکھتے ہیں:

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''جب انسانی شعور نے پہلے پہلے آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر مسلسل آتش باری کرنے والا عظیم اور مہیب گولا، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر، اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں کفِ بردہاں اور سیلاب دَر آغوش دریاؤں کی ہلاکت سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے، کبھی بادل کی لرزہ انگیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک، کبھی وحشت انگیز آندھی، کبھی بلا خیز جھکڑ، کبھی کوہ آتش فشاں کی مرگِ سیال یلغار، کبھی زلزلے کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا ازدہام، اور ان کے اندر گھرا ہوا، بے یارومددگار اور بے سروسامان نہتا ابن آدم۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات ہی کے متعلق اس کا ردِعمل اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ جو بلا سامنے آئے، اس کے سامنے گڑگڑانا شروع کردے، جہاں کوئی خطرہ دکھائی دے، یہ ماتھا ٹیک دے، اس طرح فطرت کی ہر قوت، اس کا الٰہ، اور یہ ان قوتوں کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے، گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، شیر، سانپ حتیٰ کہ وبائی امراض تک، سب دیوی اور دیوتا تصور کرلئے گئے، اور ان کی بارگاہ میں نذرونیاز، منت سماجت اور مدح وستائش سے اُنہیں خوش کرنے اور راضی رکھنے کی تدبیریں اختیار کی جانے لگیں۔''④

علم الانسان کے اس فلسفہ کی رو سے جب انسانی معاشرہ کا آغاز مظاہر فطرت سے مرعوبیت کی بنا پر اِنہیں دیوتا اور دیویاں ماننے کی صورت میں ہوا تو ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے انسان کی ابتدائی زندگی میں نبوت و رسالت اور خدائی رشد وہدایت کو ماننے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی، جسے قرآن، پیدائش آدمؑ کے ساتھ ہی آغاز پذیر قرار دیتا ہے اور ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب چونکہ مغربی فلسفہ وتحقیق سے بری طرح متاثر بلکہ مرعوب تھے اور اہل مغرب کی فکری اسیری اور ذہنی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے، لہٰذا وہ ایسی کسی صورتِ حال کے قائل نہیں ہوسکتے تھے جس میں انسانی معاشرہ کی ابتدا نورِ وحی اور ضیاے ہدایت میں ہونا قرار پائے، کیونکہ وحی و ہدایت کا وجود نبوت و رسالت کے وجود کو مستلزم ہے۔ 'مفکرِ قرآن' کی طرف سے انکارِ نبوتِ آدمؑ کی تہہ میں یہی فلسفہ کارفرما ہے۔ وہ قرآنی حقائق اور جدید تحقیقات میں کہیں

---

④ اسلام کیا ہے؟، ص ۱۹۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تضاد وتناقض پائیں تو ان کا رویہ یہ نہیں ہوتا کہ قرآنی حقائق کو حتمی، قطعی اور یقینی قرار دے کر 'جدید تحقیقات' کو یہ کہہ کر ردّ کردیں کہ ''یہ تحقیقات ابھی خام ہیں، ممکن ہے مستقبل کے علمی انکشافات اُنہیں ردّ کرکے وہ چیز پیش کردیں جو مطابق وحی ہو۔'' بلکہ وہ یہ روش اختیار کیا کرتے تھے کہ ''قرآن کے اس مقام کی توضیح ممکن ہے کہ آئندہ کے علمی انکشافات اور آثارِ قدیمہ کے حقائق سے ہوجائے۔''

اس طرح وہ ہمیشہ قرآن پر اُن مغربی تحقیقات کو شرفِ تقدم بخشا کرتے تھے جو اہل مغرب نے پیش کی ہوں۔ پرویز صاحب کے انکارِ نبوت آدمؑ میں یہ لم [تہمت] پائی جاتی ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ پرویز صاحب نے عقیدۂ نبوت آدم کو جس مغربی فلسفۂ تاریخ کی کوکھ سے برآمد کیا ہے، اب خود محققین مغرب اسے ردّ کررہے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ اپنی اُردو اور انگریزی دونوں تفسیروں میں اس کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہم یہاں اُن کی اردو تفسیر (ماجدی) کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کررہے ہیں:

''آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی۔ فرنگی 'محققین' حسبِ معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے اور ان میں سے اکثر یہی کہے گئے کہ انسان کا ابتدائی مذہب، شرک یا تعددِ آلہہ تھا۔ شروع شروع میں وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا اور عقیدۂ توحید تک تو نسل انسانی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور عقلی و دماغی ارتقا کے بڑے طویل سفر کے بعد پہنچی ہے۔ قرآنِ مجید نے اس خرافی نظریہ کو ٹھکرا کر صاف اعلان کردیا کہ نسل انسانی آغازِ فطرت میں دینی حیثیت سے ایک اور واحد تھی۔ اس میں 'مذہب' اور 'ادیان' کے یہ تفرقے کچھ بھی نہ تھے۔ أمة واحدة میں جس وحدت کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اس میں دینی اور اعتقادی ہی وحدت مراد ہے۔ كانوا على شريعة من الحق (ابن جریر عن ابن عباس) كانوا على الهدى جميعا (ابن جریر عن قتادۃ) كانوا على دين واحد وهو الإيمان والحق، هذا قول أكثر المحققين (کبیر) صدیوں کی اُلٹ پھیر، قیل وقال کے بعد اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرین اثریات، انسانیت و اجتماعیات کا (سرچارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن، پروفیسر شمڈٹ کا) یہی ہے کہ انسان کا دین اوّلین دین توحید تھا۔''[5]

الغرض ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب، قرآن کی تفسیر، قرآن سے کرنے کی بجائے، علم

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الانسان اور علم الاثریات کی روشنی میں کیا کرتے تھے، جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے عیاں ہے۔

دوسری مثال (عمر نوحؑ کے حوالے سے)

قرآن کریم کی سندیت و حجیت کا ڈھنڈورا پیٹ کر غیر قرآنی نظریات کو اپنانا 'مفکرِ قرآن' صاحب کا عام شیوہ تھا۔ وہ اپنی اُس عقل عیار کو جو فرنگی فکر کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی، قرآن پر حاکم اور قاضی بنا کر، ہر اس چیز کا انکار کرڈالا کرتے تھے جو ان کی عقلی میزان میں پورا نہیں اُترتی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی طویل العمری کو قصیر العمری میں بدلنے میں ان کی 'اجتہادی کارگزاری' اس کی واضح مثال ہے۔ قرآن کریم بالفاظِ صریحہ، یہ بیان کرتا ہے کہ

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾

''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس برس کم ایک ہزار برس، ان کے درمیان رہا۔'' (العنکبوت:۱۴)

قرآنِ کریم کی اس صراحت کے بعد 'مفکر قرآن' صاحب مفہوم آیت کو مسخ و تحریف کا نشانہ بنانے کی خاطر، خواہ مخواہ اور بلاضرورت یہ سوال اٹھاتے ہیں:

''اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال تھی؟'' ⑥

نہ معلوم یہ سوال کہاں سے اور کیسے پیدا ہوگیا، جب کہ قرآن کریم نے بالفاظِ صریحہ ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ کہہ کر خود ساڑھے نوسو سال کی عمر بیان کردی ہے اور تو اور خود پرویز صاحب نے بھی، ایک مقام پر اسی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے حضرت نوحؑ کی حقیقی عمر یہی بتائی ہے۔

''ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم، ہزار سال رہا'' ⑦

پھر وہ ساڑھے نوسو سال کی عمر کو صرف دوسو سال میں بدل ڈالنے کے لئے، رکیک اور لچر تاویلات پر اُتر آئے اور کبھی یہ کہا کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی۔ ⑧

---

⑤ تفسیر ماجدی، زیر آیت کان الناس أمة واحدہ، ص۸۳، حاشیہ ۷۷۲

⑥ تفسیر مطالب الفرقان، ج۵، ص۲۳۷ ⑦ معارف القرآن، ج۲، ص۳۷۶ ⑧ مطالب الفرقان: ۲۳۷/۵

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور کبھی تاویلاً قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے یہ کہا:

''اس آیت کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہوگیا جو نوسو سال رہا۔''(۹)

اور کبھی دور کی کوڑی لاتے ہوئے، یہ تاویل (بشرطیکہ اسے تحریف کی بجائے، تاویل کہا بھی جاسکتا ہو) کی۔

''عربی لغت میں سنة کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں، یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے اس اعتبار سے ألف سنة کے معنی ہوں گے: اڑھائی سو سال۔ اور عاماً پورے سال کو کہتے ہیں، اس لئے اگر خمسین عاماً کو (پچاس سال کو) اس میں سے منہا کردیا جائے تو باقی دوسو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔''(۱۰)

نوسو پچاس سال کی لمبی عمر کو مستبعد جاننا یہ ہے وہ لم جو خدا کی بیان کردہ صریح اور واضح مدت کی تاویل بلکہ تحریف میں کارفرما ہے۔ 'مفکرِ قرآن' کی یہ 'تحقیقِ انیق' اپنی پشت پر کوئی عقلی قوت نہیں رکھتی بلکہ یہ محض ظن وتخمین اور قیاس ورائے کا نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے کہ خدا کی بیان کردہ عمر کو عقل ماننے سے اِبا کرتی ہے۔ چنانچہ 'مفکرِ قرآن' صاحب قرآنِ کریم کی بیان کردہ صریح اور واضح مدت کے مقابلہ میں اپنی تاویلاتی موشگافیوں کی بنا پر جو قصیر العمری بیان کرتے ہیں، اسے وہ خود بھی 'قیاسات' قرار دیتے ہیں:

''یہ بہرحال قیاسات ہیں۔ تاریخی تحقیقات کسی یقینی نقطہ تک پہنچیں گی تو اس کا حتمی مفہوم سامنے آئے گا۔''(۱۱)

کیا ستم ظریفی ہے کہ فرمانِ خداوندی ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ سے تو حتمی مفہوم واضح نہیں ہوتا، اس لئے قیاسات اور ظن وتخمین کے گھوڑے دوڑائے جارہے ہیں اور ساتھ ہی تاریخی تحقیقات کا انتظار ہورہا ہے کہ وہ آکر قرآن کے ان 'غیر واضح مفاہیم' کو کسی 'حتمی مفہوم' میں بدل ڈالیں گی۔ ع بسوخت عقل ز حیرت ایں چہ بوالعجبی است

اور یہ تاریخی تحقیقات کی روشنی میں، قرآنی آیات کے مفہوم کو مرتب کرنے والا وہی 'مفکر

(۹) تفسیر مطالب الفرقان، ج ۵، ص ۲۳۷ (۱۰) تفسیر مطالب الفرقان، ج ۵، ص ۲۳۷

(۱۱) حاشیہ مفہوم القرآن، ص ۹۱۲

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن' ہے جو عمر بھر تاریخ کے بارے میں یہ اعلان کرتا رہا کہ

''ہماری باز آفرینی کے لئے طریق کار یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو قرآن کے معیار پر پرکھ کر دیکھیں جو اس کے مطابق ہو، اُسے حسن سمجھیں جو اس کے خلاف ہو اسے عیب قرار دیں''(۱۴)

لیکن خود قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرنے کے لئے ''تاریخی تحقیقات کے کسی یقینی نقطہ تک پہنچنے'' کا انتظار کرتے کرتے، سطح زمین سے بطن ارض میں منتقل ہو گیا۔

اور پھر نو سو پچاس سال کی عمر کو، دو سو سال میں بدل ڈالنے کے لئے 'مفکر قرآن' صاحب کی وہ دماغ سوزی اور جانکاہی قابل داد ہے جس کی بنا پر لغت کی کتابیں کھنگالی جارہی ہیں اور سنة کا مفہوم متعین کرنے کے لئے یہ دور کی کوڑی لائی جارہی ہے کہ سنة سال بھر کی چار فصلوں میں سے ایک فصل کو کہا جاتا ہے اور ألف سنة کہنے کا مطلب 'اڑھائی سو سال' کی مدت بیان کرنا ہے۔ پھر توقع یہ کی جارہی ہے کہ دورِ نزول قرآن کا اَن پڑھ، جاہل اور گنوار بدو ألف سنة إلا خمسين عاما کے الفاظ سن کر خود بخود [(۱۰۰۰÷۴) - ۵۰ = ۲۰۰] سال کی حسابی مساوات حل کرنے کی ریاضت کرے گا۔

اگر قرآن کو واقعی یہی دو سو سال کی مدتِ عمر بیان کرنا مقصود ہوتی تو کیا وہ مأتین کا لفظ استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ حالانکہ 'دوسو' کے لئے یہ لفظ سورۃ الانفال کی آیت ٦٦ میں مستعمل بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ألف سنة إلا خمسين عاما کا معنی [(۱۰۰۰÷۴) - ۵۰ = ۲۰۰] سال مراد لیتے ہیں، وہ خواہ زبان سے یہ نہ کہیں، مگر اپنے دل و دماغ میں وہ یہ تصور راسخ کئے بیٹھے ہیں کہ قرآن کی زبان، پہیلیوں کی زبان ہے۔ اس کے 'مصنف' کو نہ تو (معاذ اللہ) مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت تھی اور نہ ہی سلیقہ کلام۔ چنانچہ اب 'مفکر قرآن' صاحب یہ سخن سازیاں، محض اس لئے فرما رہے ہیں کہ جس بات کو خود اللہ میاں قرینے اور سلیقے سے نہیں کہہ سکے، اُسے ذرا بنا سنوار کر پیش کردیا جائے تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر ہنسنے کا موقع نہ ملے۔

مزاجِ پرویز کا ایک بنیادی پہلو

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل، مزاج پرویز کے ایک بنیادی پہلو کی نشاندہی ضروری ہے

(۱۴) طلوع اسلام، اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۳۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کا ظہور و صدور، اکثر و بیشتر مقامات پر بالعموم اور اس مقام پر بالخصوص ہوا ہے۔

پرویز صاحب، اگر واقعی قرآن مجید کو حجت اور سند سمجھتے تو ان پر لازم تھا کہ وہ ألف سنة إلا خمسين عامًا سے ۹۵۰ سال ہی مراد لیتے۔ پھر جو کوئی بھی اس طویل العمری پر شک وشبہ کا اظہار کرتا تو اُسے ہدایت فرماتے ہیں کہ ــــ ''وہ علمی انکشافات کا ابھی اور انتظار کرے تا آنکہ قرآن (وحی) کے اس مفہوم کی تصدیق بعد کے انکشافات کردیں'' ــــ یہی رویہ ان کے لئے زیبا تھا اور ایک مقام پر خود انہوں نے اسے اختیار بھی کیا تھا، چنانچہ قصہ صاحبِ موسیٰ کے ضمن میں اُنہوں نے یہی ہدایت فرمائی تھی:

''عقل انسانی، اپنی محدود معلومات کی بنا پر وحی کے کسی حکم کے خلاف اعتراض کرتی ہے، لیکن جب اس کی معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو کچھ وحی نے کہا تھا، وہ صحیح تھا۔ لہٰذا عقل کے لئے صحیح روش یہی ہے کہ وہ وحی کی بات تسلیم کرے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتی رہے۔ جب اسے صحیح معلومات حاصل ہوجائیں گی تو وہ خود بخود وحی کی تصدیق کردیں گی۔''[۱۳]

یہ وہ نصیحت ہے جو وہ دوسروں کو کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کا اپنا طرزِ عمل اس نصیحت کے برعکس یہ ہے کہ وہ اب وحی کی بیان کردہ عمر نوح کو عقلاً مستبعد سمجھتے ہیں اور قیاسات کی بنا پر آیات کی رکیک تاویلات پر جت جاتے ہیں، اور قرآنی الفاظ میں عمر نوحؑ کے متعلق ایک نیا تصور گھسیڑتے ہیں اور زبان حال سے یہ فرماتے ہیں کہ ــــ

''ان قیاسی مفاہیم کو قبول کرلو، یہاں تک کہ علمی تحقیقات، عمر نوحؑ کے کسی قطعی مفہوم کو سامنے لے آئیں، اور پھر قرآن کا بیان کردہ غیر واضح مفہوم، واضح ہوجائے۔'' ــــ

اب ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل صرف وہی شخص اختیار کرسکتا ہے جو قرآنی بیان پر یقین کرنے کی بجائے خارج از قرآن نظریات کے سامنے سجدہ ریز ہو، اور پھر اس کوشش میں جت گیا ہو کہ قرآن کو چھیل چھال کر اپنے دل و دماغ میں رچے بسے خیالات کے مطابق ڈھال دیا جائے ورنہ قرآن مجید پر پختہ اور مستحکم ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ طرزِ عمل کبھی اختیار نہیں کرسکتا۔

---

۱۳ مفہوم القرآن، ص ۶۷۹

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسری مثال (قتل ابناءِ بنی اسرائیل)

قرآنِ کریم یہ بیان کرتا ہے کہ فرعون نے سرزمین مصر میں، بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر ڈالنے کا ظالمانہ قانون نافذ کررکھا تھا۔ سورۃ القصص میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿طٰسٓمٓ تِلْكَ آيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَإِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۞ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَآءَهُمْ إِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۞ وَنُرِيْدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۞ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۞ وَأَوْحَيْنَآ إِلٰى أُمِّ مُوْسٰى أَنْ أَرْضِعِيْهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ إِنَّا رَآدُّوْهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (القصص:۱ تا ۷)

"طٰس ٓمٓ: یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں، ہم موسیٰ اور فرعون کا حال ٹھیک ٹھیک آپ کو سناتے ہیں، ایسے لوگوں کے (فائدے کے) لئے جو ایمان لائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کردیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ دباتا تھا، اس کے بیٹوں کو وہ قتل کرتا تھا اور اس کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ فی الواقعہ وہ مفسد لوگوں میں سے تھا اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ ان لوگوں پر مہربانی کریں جو زمین میں دبا کر رکھے گئے تھے اور اُنہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین پر ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون، ہامان اور اس کے لشکروں کو وہی کچھ دکھا دیں جس کا اُنہیں ڈر تھا۔ ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلا اور جب تمہیں اس کی جان کو خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے۔ کچھ خوف اور غم نہ کر، ہم اسے واپس تیرے ہی پاس لے آئیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔"

ان آیات میں ولادتِ موسیٰ سے قبل، فرعون کی اسی ظالمانہ پالیسی کا ذکر ہے جس کے تحت وہ بنی اسرائیل کے نوزائیدہ بچوں کو قتل اور ان کی بچیوں اور عورتوں کو زندہ رکھا کرتا تھا۔ اسی ظالمانہ قانون کے خوف کے باعث، ولادتِ فرزند پر، والدۂ موسیٰ پریشان ہیں، اسی خوف

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

و پریشانی میں اللہ بزرگ و برتر نے اُنہیں وحی کی کہ "بچے کی جان کا اگر تجھے خوف ہو تو اسے سپردِ بحر کر دینا۔" سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۷ میں بھی، ابنائے بنی اسرائیل کو مستقبل قریب میں قتل کرنے کا فرعونی ارادہ مذکور ہے، مگر یہ اسی قانون کے دوسری مرتبہ نفاذ کا ذکر ہے جبکہ پہلی مرتبہ یہی قانون اُس وقت نفاذ پذیر ہوا تھا جبکہ حضرت موسیٰ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان آیات کے علاوہ بھی ایسی متعدد آیات ہیں جن میں نرینہ اولاد کو قتل کرنے اور بچیوں اور عورتوں کو زندہ رکھنے کا تذکرہ پایا جاتا ہے، مثلاً سورۃ البقرۃ آیت ۴۹، سورۃ الاعراف آیت ۱۴۱ سورۃ ابراہیم آیت ٦ وغیرہ۔

لیکن ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب کو فرعون کے ساتھ جو قلبی لگاؤ ہے، اس کی بنا پر وہ اسے اس ظلمِ عظیم سے بری اور بالاتر قرار دیتے ہیں اور قرآنی آیات کو اپنی بدترین تحریفات کا نشانہ بنا کر فرعونی پالیسی کو بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

"اسکی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہر مردانگی نظر آتے، ذلیل و خوار کرکے، غیر مؤثر بنا دیتا اور جوان جوہروں سے عاری ہوتے اُنہیں اُبھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اسی طرح وہ اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کرکے ان کی قوت کو توڑتا چلا جاتا۔"[۱۴]

یہ جناب پرویز صاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ وہ قرآن مجید کو مداری کی ایسی پٹاری بنا کر رکھا کرتے تھے جس میں سے جب اور جیسا چاہا مفہوم برآمد کرلیا۔ قتل ابنائے بنی اسرائیل کے مفہوم کے تعین میں وہ ہمیشہ یہی رویہ اپناتے رہے، پھر اپنے ان متجددانہ مفاہیم کو اپنی خود ساختہ لغات القرآن سے متعین کر ڈالنے کے بعد بھی وہ قلبی طور پر اس سے غیر مطمئن ہی رہے چنانچہ زیر بحث مسئلہ میں، پانی میں مدھانی چلانے کے اس طویل عمل کے بعد یہ لکھتے ہیں:

"قتل یا ذبح ابناء سے یہی مراد ہے، لیکن بہرحال یہ ایک اندازہ ہے جس پر مزید غور کیا جاسکتا ہے۔"[۱۵]

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

"قرآنی شواہد سے قیاس کا رُخ اس طرف جاتا ہے کہ ذبح ابناء اور استحیاء نساء کے الفاظ استعارۃً استعمال ہوئے ہیں۔ "سچ مچ قتل کردینے" کے معنوں میں نہیں۔ لیکن جیسا

---

[۱۴] مفہوم القرآن، زیر آیت ۲۸/۴، ص ۸۸۳ [۱۵] لغات القرآن، ص ۶۹۳

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ ہم نے کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے جس کے دلائل اوپر دیے گئے ہیں۔ اگر ان دلائل کو قوی نہ سمجھا جائے تو ذبح ابناء کو حقیقی معنوں میں لیا جائے گا، یعنی فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو سچ مچ قتل کر دیا کرتا تھا..." ⑯

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ پرویز صاحب، جس چیز کو 'دلائل' اور 'قرآنی شواہد' کا نام دیا کرتے تھے، وہ دراصل ان کی وہ تحریفات و تلبیسات ہیں جنہیں وہ الفاظِ قرآن سے روحِ قرآن کے خلاف، متن قرآن سے عقلی کشتی اور ذہنی دنگل لڑ کر کشید کیا کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ صرف اس لئے کہ ان کا ایمان قرآن کی بجائے مغرب کی تحقیقات پر تھا۔ لہٰذا وہ مجبور تھے کہ قرآن کریم کو چھیل چھال کر 'افکارِ جدیدہ' کے مطابق ڈھال دیں۔ چنانچہ اسی زیر بحث مسئلہ میں قتل کا معنی 'جان سے مار ڈالنا' کی بجائے 'جوہر مردانگی سے عاری کر کے، ذلیل و خوار کرتے ہوئے غیر مؤثر بنا ڈالنا' وہ صرف اسلئے بیان کیا کرتے تھے کہ

"...اس وقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جس قدر پردے اُٹھے ہیں ان میں سے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔ ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو۔ اس وقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو مارنے کا حکم دے رکھا تھا۔ (کتاب خروج) لیکن تاریخی نقطہ نگاہ سے، موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔" ⑰

'مفکرِ قرآن' کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری

اقتباسِ بالا نے پرویز صاحب کی مغرب کے سامنے ان کی ذہنی اور فکری اسیری کو بالکل بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ قرآنِ کریم، بالفاظِ صریحہ فرعون کے متعلق یہ کہتا ہے کہ ﴿يُذَبِّحُ أَبْنَاءَ هُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَ هُمْ﴾ (۲۸/۴) یعنی " وہ ان کے بیٹوں کو ذبح اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھا کرتا تھا۔" فرعونیوں کے متعلق بھی، قرآن صراحت سے بیان کرتا ہے: ﴿يُذَبِّحُوْنَ أَبْنَاءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَ كُمْ﴾ (۲/۴۹) یعنی "وہ تمہارے بچوں کو ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیا کرتے تھے۔" ایک اور مقام پر يذبّحون کی جگہ

---

⑯ لغات القرآن، ص ۶۹۴ ⑰ لغات القرآن، ص ۶۹۴

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یقتلون کہا گیا ہے۔ یعنی "خوب قتل کیا کرتے تھے" الغرض، قرآن نے یقتلون کا لفظ استعمال کیا ہو یا یذبحون کا، دونوں کا مفہوم 'جان سے مار ڈالنا' ہی ہے۔ لیکن ہمارے 'مفکر قرآن' کو یہ حقیقی اور عام فہم مفہوم قابل قبول نہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ابھی تک حجری اور اثری انکشافات نے اس معنی کی تصدیق نہیں کی۔ گویا اصل قابل اعتماد ماخذ کتاب اللہ نہیں بلکہ تاریخی آثار وانکشافاتِ آثار قدیمہ ہیں۔ لہٰذا مفہومِ قرآن ان ہی کی روشنی میں متعین کیا جائے گا۔ یعنی قرآنی الفاظ کا مفہوم قطعی نہیں بلکہ تاریخی کتبات سے برآمد ہونے والا مفہوم قطعی ہے۔ یہ رویہ، مغرب کی انتہائی ذہنی غلامی کا غماز ہے۔

'مفکرِ قرآن' صاحب پڑھتے تو قرآن ہی رہے ہیں، مگر سوچتے رہے ہیں تہذیبِ غالب کی تحقیقات کی روشنی میں۔ آنکھیں تو ان کی اپنی ہی تھیں، مگر دیکھتے رہے ہیں مغرب کے زاویۂ نگاہ سے۔ کان تو ان کے اپنے ہی تھے، مگر وہ سنتے رہے ہیں علماے مغرب کی سخن سازیاں۔ دماغ تو ان کا اپنا ہی تھا، مگر اس میں فکر اور سوچ اغیار ہی کی تھی۔ الفاظ تو وہ اپنی زبان سے قرآن ہی کے ادا کرتے رہے ہیں مگر ان کے اندر معانی وہ فکرِ جدید سے لے کر داخل کیا کرتے تھے۔ زبان تو ان کی اپنی ہی تھی، مگر بات وہ غیروں ہی کی کیا کرتے تھے:

؎ میں اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے، بات اُن کی
میں اُنہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے، رات اُن کی

مزید برآں ہمارے 'مفکرِ قرآن' ہوں یا دیگر منکرین حدیث! ان کی یہ بات کس قدر قابل تعجب اور موجبِ صد حیرت ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے متعلق بخاری، مسلم، موطأ اور دیگر کتبِ احادیث کی شہادتوں کو بلا تکلف ردّ کردیتے ہیں اور محققین فرنگ کی آثارِ قدیمہ سے ماخوذ، تاریخی شہادت کو قبول کرلیتے ہیں، حالانکہ یہ تاریخی شہادتیں، ان شہادات کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں رکھتی ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے متعلق احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ منکرین حدیث، مغرب کی جن تاریخی شہادتوں پر اعتماد کرتے ہیں، ان میں سے قوی سے قوی ذریعہ بھی، ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی کی ضعیف سے ضعیف حدیث کے مقابلہ میں بھی ہیچ ہے، لیکن بُرا ہو ذہنی غلامی کا، ستیاناس ہو دماغی مغلوبیت

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا، بیڑہ غرق ہو فکری اسیری کا، جس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب فرماتے ہیں کہ قتل ابناء بنی اسرائیل یا بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد کو مذبوح ومقتول بیان کرنے والی آیات میں 'جان سے مار ڈالنے' کا معنی اس لئے قابل قبول نہیں کہ ـــ ''اس وقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جس قدر پردے اُٹھے ہیں، ان میں سے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا ہے، ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو'' ـــ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآنی الفاظ کے قطعی مفہوم کو نظر انداز کرکے، مصر کی تاریخ پر سے مزید پردوں کے اُٹھنے کا شدید انتظار کرتے کرتے، وہ شخص مرگیا جو اُٹھتے بیٹھتے قرآن قرآن کی دہائی دیا کرتا تھا، اور قرآن کے اوّل وآخر سند ہونے کی رٹ لگائے رکھتا تھا۔ اب گویا جب اثری تحقیقات کی وجہ سے حیاتِ پرویز ہی میں، کوئی ایسی شہادت مل جاتی جو ولادتِ موسیٰؑ کے وقت ابناء بنی اسرائیل کو 'جان سے مار ڈالنے' کا انکشاف کردیتی تو پھر 'مفکر قرآن' صاحب ایک اور قلا بازی کھاتے اور مفہوم قرآن بدل کر کچھ اور ہوجاتا۔ اور جب تک کوئی ایسی شہادت نہیں مل پاتی، اس وقت تک 'پیروانِ دعوتِ قرآنی' پر لازم ہے کہ وہ 'مفکر قرآن' کے اندازاً بتائے ہوئے معانی ہی کو سینے سے لگائے رکھیں۔

تورات اور 'مفکر قرآن'

اور یہ بھی کیا خوب کہا ہے کہ ـــ ''اسرائیلی بچوں کو سچ مچ مار ڈالنے کا فرعونی حکم صرف تورات میں پایا جاتا ہے، مگر موجودہ تورات ساقط الاعتبار ہے۔''

یہاں ہمارے 'مفکر قرآن' کا یہ دورُخا پن بھی قابل غور ہے کہ اُنہوں نے جب اور جہاں چاہا، تورات کے ان واقعات کو بھی جو مطابق قرآن ہیں یہ کہہ کر ردّ کردیا کہ یہ واقعات تورات جیسی ساقط الاعتبار کتاب سے ماخوذ ہیں (مثلاً یہی قتل ابناء بنی اسرائیل کے واقعات)، لہٰذا ناقابل قبول ہیں۔ لیکن دوسری طرف توراتِ محرفہ کے جن واقعات کو وہ اپنے اُن تصورات

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے موافق پاتے ہیں، جنہیں وہ منسوب الیٰ القرآن کرڈالتے ہیں، اُنہیں وہ ہاتھوں ہاتھ قبول کرلیتے ہیں (مثلاً یوسفی دورِحکومت کا اقتصادی نظام)۔ پھر اس وقت نہ تورات اُنہیں تحریف شدہ نظر آتی ہے اور نہ ہی ساقط الاعتبار۔

'مفکر قرآن' کی اُلٹی گنگا

بنی اسرائیل کے ساتھ فرعون کے اس ظالمانہ طرزِ عمل کو قرآنِ کریم میں چھ مقامات پر بیان کیا گیا ہے: ① سورۃ البقرۃ آیت ۴۹ ② سورۃ الاعراف آیت ۱۲۷ ③ سورۃ الاعراف:۱۴۱ ④ سورہ ابراہیم آیت ٦ ⑤ سورۃ القصص آیت ۴ ⑥ سورۃ المومن آیت ۲۵ ان میں سے تین مقامات پر 'قتل' کا، اور تین مقامات پر 'ذبح' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ 'مفکر قرآن' صاحب نے قتل کے چھ مختلف معانی بیان کئے ہیں، جن میں سے ایک معنی 'جان سے مار ڈالنا' بھی ہے۔ فی الحال اس بات کو نظر انداز کیجئے کہ باقی پانچ معانی فی الواقعہ درست ہیں یا نہیں، لیکن لفظ ذبح کا ایک ہی معنی بیان کیا ہے، جو 'جان سے مار ڈالنے' ہی کے مفہوم کا حامل ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ذبح یذبح اندر کی طرف سے سر اور گردن کے جوڑ سے حلق کاٹ دینا، چیر دینا، شق کردینا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔''⑱

اب جبکہ قرآن خود ہی 'قتل ابناء' کی وضاحت 'ذبح ابناء' سے کرتا ہے تو قتل کا وہی مفہوم از روئے قرآن اولیٰ اور انسب ہوگا جو 'قتل' اور 'ذبح' کے دونوں لفظوں میں مشترک ہے اور وہ 'جان سے مار ڈالنے' ہی کا مفہوم ہے۔ ہمارے 'مفکر قرآن' کے فکر کی بنیادی خامی یہ ہے کہ یہاں بجائے اس کے کہ ذبح کے واحد مفہوم کی روشنی میں 'قتل' کے متعدد اور مختلف مفاہیم سے، ایک مفہوم کو متعین کریں وہ الٹا 'ذبح' کے منفرد اور قطعی مفہوم کو 'قتل' کے مختلف اور متفرق معانی کی روشنی میں چھ معانی تک وسیع کرڈالتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کرڈالنے کی آخر کیا قرآنی دلیل ہے۔

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذرا سوچئے تو سہی کہ جب 'قتل' کی توضیح مفہوم خود اللہ تعالیٰ ہی نے 'ذبح' کے لفظ سے کردی ہے جس کا واحد مفہوم 'جان سے مار ڈالنا' ہے تو پھر 'مفکر قرآن' اس خدائی توضیح وتشریح کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ صرف اور صرف اس لئے کہ اُنہیں اپنے 'مزعومات' قرآنی حقائق کی نسبت عزیز تر تھے۔ اور یہ 'مزعومات' وہ تصورات ہیں جو مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری کے باعث اُنہوں نے اپنے قلب و دماغ میں جمار کھے تھے اور جن کی تائید کے لئے ایک طرف، قرآن کی تفسیر کی آڑ میں، وہ حدِ تحریف کو پہنچی ہوئی رکیک تاویلات کے درپے رہتے تھے اور دوسری طرف مصری کتبات، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات اور مزید تاریخی انکشافات کے منتظر رہتے تھے جو اُن کے نزدیک الفاظِ قرآن سے بھی زیادہ قطعی الثبوت قرار پاچکے تھے تاکہ ان کی روشنی میں قتل ابناء اور ذبح ابناء والی قرآنی آیات کے مفہوم کو متعین کیا جاسکے۔ حالانکہ تاریخ اور قرآن کی حیثیت کو بہ تکرار واصرار وہ یوں بیان کیا کرتے تھے کہ

"تاریخ بہرحال ظنی ہے اور اس کے مقابلہ میں قرآن ایک یقینی شہادت ہے۔"[۱۹]

کیا یہ ستم ظریفی قابل داد نہیں کہ 'مفکر قرآن' جو ہمیشہ عقل و دانش کی روشنی میں قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرنے کے مدعی رہے ہیں۔ قرآن کی 'ذبح ابناء بنی اسرائیل' سے متعلقہ آیات (جو قرآن ہونے کی بنا پر قطعی اور یقینی ہیں) کی تفسیر تاریخ مصر سے کرنا چاہتے تھے جس پر سے اُٹھنے والے پردوں کے بعد بھی جو کچھ سامنے آتا یا آئندہ سامنے آئے گا، وہ بہرحال ظنی ہی ہوگا۔ (جاری ہے)

نوٹ: محدث نومبر ۲۰۰۵ء میں شائع شدہ مضمون 'طلوعِ اسلام کے حضور' میں تین حوالہ جات کی تصحیح وتکمیل فرمالیں، یہ حوالہ جات اُس شمارہ کے صفحہ ۵۲، ۵۳ اور ص ۶۲ پر دیے گئے ہیں:

⑮ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۶۰ ⑯ طلوعِ اسلام مئی ۲۰۰۵ء، ص ۳۰ ⑬ مقامِ حدیث، ص ۵۱

☜ صفحہ ۵۷ پر جسٹس ایس اے رحمٰن کی بجائے جسٹس محمد شفیع پڑھا جائے کیونکہ مولانا مودودیؒ کی جسٹس ایس اے رحمٰن سے اس موضوع پر مراسلت تو ہوئی تھی لیکن اس کو 'سنت کی آئینی حیثیت' میں شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ اسی مراسلت کے سلسلے کا ایک مضمون 'محدث' کے فتنہ انکارِ حدیث نمبر (ص ۱۸۷ تا ۱۹۶) میں شائع شدہ ہے۔

---

⑱ لغات القرآن، ص ۶۸۸

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ